

مروجہ اسلامی بینکاری کا ایک جائزہ

اسلامی بینکاری کے حوالہ سے اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد نے آل پاکستان علماء کفرس منعقد کرنے کا پروگرام بنایا ہے اور اس سلسلے میں ملک کے جید علماء اور مفتی حضرات سے جدید مسائل پر رائے طلب کی۔ زیر نظر مضمون ان مسائل پر دارالعلوم حقانیہ کے مولانا مفتی غلام قادر صاحب نے کونسل کے سوالنامہ کے جواب میں قیمتی نقطہ نظر پیش کیا ہے، افادہ عام اور اظہار خیال کے لئے شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

سوال نمبر ۱۔ اسلامی بینکاری کی اصل بنیاد اور سود کی اصل متبادل اساس کے لئے شریعت کی روشنی میں تصورات، عملی صورتیں اور شرائط وغیرہ کیا ہیں؟ آج کے حالات میں انہیں کس طرح بروئے کار لایا جاسکتا ہے؟
جواب۔ سودی بینکاری کا متبادل نظام۔

سودی بینکاری کے متبادل نظام پر گفتگو سے پہلے چند بنیادی باتیں ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔
(۱) سودی بینکاری کا متبادل تلاش کرنے کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ مروجہ بینک جتنے کام جس انداز سے کر رہے ہیں وہ سارے کام کم و بیش اسی انداز سے انجام دیئے جاتے رہیں اور ان کے مقاصد میں کوئی فرق واقع نہ ہو، کیونکہ اگر سب کچھ وہی کرنا ہے جواب تک ہوتا رہا ہے تو ”متبادل طریق کار“ کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ متبادل کا مطلب یہ ہے کہ بینک کے جو کام موجودہ تجارتی حالات میں ضروری یا مفید ہیں۔ ان کے انجام دہی کے لئے ایسا طریق کار اختیار کیا جائے جو شریعت کے اصولوں کے دائرے میں ہو اور جس سے شریعت کے معاشی مقاصد پورے ہوں اور جو کام شرعی اصولوں کے مطابق ضروری یا مفید نہیں ہیں اور جنہیں شرعی اصولوں کے مطابق ڈھالا نہیں جاسکتا ان سے صرف نظر کی جائے۔

(۲) چونکہ سود کی نمانعت کا اثر تقسیم دولت کے پورے نظام پر پڑتا ہے اس لئے یہ توقع کرنا بھی غلط ہوگا کہ سود کے شرعی متبادل کو برسر کار لانے سے تمام متعلقہ فریقوں کے نفع کا تناسب وہی رہے گا جو اس وقت سودی نظام میں پایا جاتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلامی احکام کو ٹھیک ٹھیک روکا لایا جائے تو اس تناسب میں بڑی بنیادی تبدیلیاں

آسکتی ہیں بلکہ یہ تبدیلیاں ایک مثالی اسلامی معیشت کے لئے ناگزیر طور پر مطلوب ہیں۔

(۳) آج کل بنک جو خدمات انجام دیتا ہے ان میں یہ پہلو مفید بلکہ موجودہ معاشی حالات کے پیش نظر ضروری ہے کہ وہ لوگوں کی منتشر انفرادی بچتوں کو یکجا کر کے انہیں صنعت و تجارت میں استعمال کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ بچتیں اگر ہر شخص کی اپنی تجوری میں پڑی رہتیں تو ان سے صنعت و تجارت کے فروغ میں کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا اور ظاہر ہے کہ فاضل دولت کا ست پڑا رہنا نہ شرعی اعتبار سے مطلوب ہے نہ عقلی اور معاشی اعتبار سے۔ اسے مفید کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ان بچتوں کو صنعت و تجارت میں مصروف کرنے کیلئے جو راستہ مروجہ بنکوں نے اختیار کیا ہے وہ قرض کا راستہ ہے چنانچہ یہ ادارے سرمایہ داروں کو اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ دوسروں کے مالی وسائل کو اپنے منافع کیلئے اس طرح استعمال کریں کہ ان وسائل سے پیدا ہونے والی دولت کا زیادہ حصہ خود ان کے پاس رہے اور سرمایہ کے اصل مالکوں کو ابھرنے کا کما حقہ موقع نہ مل سکے۔

چنانچہ مروجہ نظام بنکاری میں بنک کی حیثیت محض ایک ایسے ادارے کی ہے جو روپے کا لین دین کرتا ہے اسے اس بات سے سروکار نہیں ہے کہ اس روپے سے جو کاروبار مورہا ہے۔ اس کا منافع کتنا ہے؟ اور اس سے کس کو فائدہ اور کس کو نقصان پہنچ رہا ہے؟

اسلامی احکام کی رو سے بنک ایسے ادارے کی حیثیت میں باقی نہیں رہ سکتا جس کا کام صرف روپے کا لین دین ہو۔ اس کے بجائے اسے ایک ایسا تجارتی ادارہ بنانا پڑے گا جو بہت سے لوگوں کی بچتوں کو اکٹھا کر کے ان کو براہ راست کاروبار میں لگائے اور وہ سارے لوگ جن کی بچتیں اس نے جمع کی ہیں براہ راست اس کاروبار میں حصہ دار بنیں اور ان کا نفع و نقصان اس کاروبار کے نفع و نقصان سے وابستہ ہو جو ان کے سرمایہ سے بالآخر انجام دیا جا رہا ہے۔ لہذا سودی بنکاری کے متبادل جو انتظام تجویز کیا جائے گا۔ اس پر یہ اعتراض نہ ہونا چاہیے کہ بنک نے اپنی سابقہ حیثیت ختم کر دی ہے اور وہ بذات خود ایک تجارتی ادارہ بن گیا ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی جس کی وجہ سے متبادل نظام کی تلاش کی جا رہی ہے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ صدیوں سے بیٹھے اور جمے ہوئے کسی نظام کو بدل کر اسکی جگہ ایک نیا نظام جاری کرنے میں ہمیشہ مشکلات ہوتی ہیں۔ لیکن اگر نظام کی تبدیلی ضروری ہو تو صرف ان مشکلات کی بناء پر نئے نظام کو ناقابل عمل قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ ایسے میں ان مشکلات کا حل تلاش کیا جاتا ہے ان مشکلات کے خوف سے پیش قدمی نہیں روکی جاتی۔

بینکنگ کا شرعی طریق کار: اس تمہید کے بعد اب وہ تجاویز پیش کی جاتی ہیں جو بینکنگ کو شرعی اصول کے مطابق چلانے کے لئے پیش کر گئی ہیں۔ پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ بینکنگ کا تعلق دو طرفہ ہوتا ہے۔ ایک طرف اس کا تعلق ان

لوگوں سے ہوتا ہے جنہوں نے اپنی رقمیں بنک میں رکھوائی ہیں۔ دوسری طرف ان کے ساتھ تعلق ہوتا ہے جن کو بنک تمویل کرتا ہے یعنی سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ دونوں قسم کے تعلقات پر الگ الگ گفتگو کی جاتی ہے۔

بنک اور ڈپازٹر کا تعلق: موجودہ نظام میں بنک میں جو رقمیں رکھوائی جاتی ہیں آجکل بینکنگ کی اصطلاح میں انکو ”امانت“ کہا جاتا ہے لیکن فقہی اعتبار سے حقیقت میں وہ قرض ہوتا ہے۔ اگر بینک کو اسلامی طریقے سے چلایا جائے تو ”امانتداروں“ کیساتھ بنک شرکت یا مضاربت کا معاملہ کریگا۔ اس طریقے میں وہ رقم قرض نہیں ہوگی، بلکہ اب صورتحال یہ ہوگی کہ رقم رکھوانے والے ”رب المال“ ہونگے اور بنک مضارب ہوگا اور لگایا ہوا سرمایہ ”راس المال“ ہوگا جس پر بنک کسی خاص شرح سے نفع دینے کا پابند نہیں ہوگا بلکہ جو کچھ نفع حاصل ہوگا وہ ایک طے شدہ تناسب کے مطابق تقسیم ہوگا۔ پھر ”کرنٹ اکاؤنٹ“ یا ”الحساب الجاری“ میں بنک آج بھی ڈپازٹر کو کوئی سود نہیں دیتے۔ اسلامی طریق کار میں بھی اس مد پر کوئی منافع نہیں دیا جائے گا اور کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھی ہوئی رقم ڈپازٹر کی طرف سے بنک کو دیا ہوا غیر سودی قرض سمجھا جائیگا البتہ دوسرے نفع بخش کھاتے ”مضاربت“ یا ”شرکت“ کے کھاتوں میں تبدیل ہو جائینگے

البتہ ان کھاتوں کو مضاربت یا شرکت سے بدلنے میں یہ عملی دشواری معلوم ہوتی ہے کہ شرکت کا عام قاعدہ یہ ہے کہ تمام کھاتہ داروں کی رقم ایک ساتھ مشترک کھاتے میں آئے اور ایک ہی وقت پر نفع و نقصان کا حساب کر کے تمام شرکاء میں نفع و نقصان تقسیم کیا جائے۔ لیکن بنک میں یہ بات قابل عمل نہیں ہو سکتی کیونکہ یہاں لوگوں کے رقم رکھوانے اور نکالنے کا سلسلہ مستقل طور پر جاری رہتا ہے۔ فلکسڈ ڈپازٹ میں اگرچہ نکلوانے کی مدت تو مقرر ہوتی ہے۔ لیکن رکھوانے کا وقت مقرر نہیں، ہر شخص ہر روز فلکسڈ ڈپازٹ کا کھاتہ کھول سکتا ہے اور سیونگ اکاؤنٹ میں نہ نکلوانے کی تاریخ مقرر ہے، نہ رکھوانے کی۔

اں کی ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ نظام تبدیل کیا جائے اور لوگوں کو پابند کیا جائے کہ وہ ایک خاص تاریخ میں رقم جمع کرائیں اور ایک خاص تاریخ ہی میں نکالیں۔ اور شرکت کی مدت سہ ماہی یا ماہانہ مقرر کر لی جائے اور ہر مدت کے اختتام پر نفع و نقصان کا حساب کر کے اس کی تقسیم عمل میں آئے لیکن اس صورت میں اول تو لوگوں کے لئے بنک میں رقم رکھوانے میں مشکلات پیش آئیں گی، ایک ہی تاریخ میں رکھوانے اور ایک ہی تاریخ میں نکلوانے سے بینکوں پر پریشر بھی بڑھے گا اور اس کے نتیجے میں بہت سی پختیں کام میں لگنے سے رہ جائیں گی۔

لہذا بینکوں کی شرکت و مضاربت میں نفع کی تقسیم کا ایک اور طریق کار بعض حلقوں کی طرف سے تجویز کیا گیا ہے جس کو اکاؤنٹنگ کی اصطلاح میں ”الحساب الیومی“ یا روزانہ پیداوار پر مبنی حساب کہا جاتا ہے۔ اس تجویز کا حاصل یہ ہے کہ شرکاء کو یہ آزادی دی جائے کہ وہ جب چاہیں مخصوص قواعد کے مطابق بنک سے رقمیں نکال لیں یا اس میں داخل کرتے رہیں۔ لیکن جب ایک مدت شرکت ختم ہو تو پھر کھاتہ کھول دیا جائے گا اس مدت میں کتنی رقم کتنے دن بنک میں رہی اور

فی روپیہ فی یوم منافع کا اوسط کیا رہا پھر جس شخص کے جتنے روپے اس مدت کے دوران جتنے دن بنک میں رہے، اس کے حساب سے نفع تقسیم کر دیا جائے۔

سوال نمبر ۲۔ آج کل بہت سے بنک اسلامی بنکاری کے نام سے کام کر رہے ہیں ان کی بنکاری کہاں تک اسلامی اصولوں کے مطابق ہے؟ کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟ شریعت کی روشنی میں اسلامی بنکاری کی صورت ہے؟

جواب۔ جن بینکوں میں اسلامی بنکاری کے نام سے جو کام ہو رہا ہے اس کے بارے میں مجھے جو معلومات حاصل ہیں تو میں اپنے علم کے مطابق غیر ذمہ دارانہ طور پر کہتا ہوں کہ اس میں کاروبار مکمل طور پر سود سے خالی نہیں ہے بلکہ بعض مسائل میں وہ مجبوری کے تحت سودی معاملات میں شریک ہیں لیکن مالا یدرک کھلہ لا یدرک کھلہ کے قاعدہ کے مطابق وہ معاملات جو اسلامی اصولوں کے مطابق ہیں ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ اور جو معاملات اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں ہیں انکی اصلاح کرنی چاہیے۔

سوال نمبر ۳۔ بہت سے بنک اجارہ کے نام سے لوگوں کو گاڑیاں دے رہے ہیں کیا بینکوں کی یہ کارساز سکیمیں شرعی اصولوں کے مطابق درست ہیں؟

جواب۔ اجارہ: سرمایہ حاصل کرنے کا ایک طریقہ رائج ہے جس کو اجارہ کہتے ہیں۔ اجارہ دو طرح کا ہوتا ہے ایک آپریٹنگ لیز (Operating Leas) یہ وہ اجارہ ہے جو عام طور پر معروف ہے اس میں واقعتاً فریقین میں موجد اور مستاجر کا رشتہ ہوتا ہے یہ اجارہ سرمایہ حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہوتا۔ سرمایہ حاصل کرنے کا ذریعہ دوسری قسم کا اجارہ ہے جس کو فنانشل لیز (Financial Leas) کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہاں اصل مقصود اجارے کا رشتہ قائم کرنا نہیں، ہوتا بلکہ کمپنی کو جامد اثاثوں (مثلاً مشینری) کی ضرورت ہے تو کمپنی بنک سے قرض لے کر خود مشینری خریدنے کی بجائے کسی بنک یا مالیاتی ادارے کو یہ کہتی ہے کہ یہ مشینری خرید کر ہمیں کرایہ پر دے دو۔ اس دوران مشینری کا مالک بنک یا مالیاتی ادارہ ہوگا اور کمپنی کرایہ دار ہونے کی حیثیت سے اسے استعمال کرتی ہے ایک مخصوص مدت کے لئے کرایہ اس تناسب سے طے کیا جاتا ہے کہ اس میں مشینری کی قیمت بھی وصول ہو جائے اور اتنی مدت کے لئے اگر یہ رقم قرض دی جاتی تو اس پر جتنا سود ملتا تھا وہ بھی وصول ہو جائے۔ جب یہ مدت گزر جاتی ہے اور کرایہ کی شکل میں مشینری کی قیمت بمعہ معینہ شرح سود ادا ہو جاتی ہے تو اب یہ مشینری خود بخود کمپنی کی ملوک بن جاتی ہے یہ بات کبھی معاہدے میں لکھی ہوتی ہے اور کبھی لکھی تو نہیں جاتی مگر معروف اسی طرح ہے۔

قرض کی بجائے اجارہ کا یہ طریقہ اختیار کرنے کے دو مقصد ہوتے ہیں۔

(۱) اس کی وجہ سے بعض صورتوں میں ٹیکس سے بچت ہو جاتی ہے یا ٹیکس میں کمی ہو جاتی ہے۔

(۲) قرض کی وصولیابی کے لئے اجارہ کا طریقہ نسبتاً قرض کے زیادہ مدت کا اعتماد ہے اس لئے کہ

اجارے میں مشینری موجد کی ملکیت میں ہوتی ہے۔ اس پر اس کا لیبیل لگا رہتا ہے۔ اگر بالفرض رقم نہ ملی تو موجد کو کوئی خطر نہیں، اس لئے کہ مشینری اس کی ملکیت میں ہے۔

اجارہ بھی تمویل کا ایک شرعی طریقہ ہے جس کی وضاحت ہو چکی۔ اب اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ محض اجارے کا لفظ دیکھ کر کسی معاملے کو شرعی نہیں قرار دینا چاہیے۔ اس لئے کہ آج کل عموماً اجارے کے جو معاملات ہوتے ہیں ان میں اجارے کی حقیقت موجود نہیں۔ اجارے کی حقیقت یہ ہے کہ موجد جو مشینری وغیرہ اجارے پر دے رہا ہو وہ اس کا مالک اور ذمے دار ہو، مگر تمویلی اجارے میں آج کل عملاً ایسا نہیں ہوتا۔ موجد اس مشینری کی کسی قسم کی ذمہ داری نہیں لیتا ہے۔ اگر مشینری کا نقصان ہو جائے تو وہ مستاجر کا نقصان سمجھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ کسی حادثے میں مشینری تباہ ہو جائے تو بھی مستاجر کو یہ دینا رہتا ہے۔ موجد کا تعلق اس مشینری سے صرف اتنا ہوتا ہے کہ عدم ادائیگی کی صورت میں وہ مشینری کو بیچ کر اپنا قرضہ وصول کر لیتا ہے لہذا آج کل عموماً حقیقی اجارہ نہیں ہوتا اصل مقصد تو سود پر قرض دینا ہی ہوتا ہے۔ مگر ٹیکس میں بچت کرنے کے لئے اجارے کا نام دیا جاتا ہے۔ اس طرح کے معاملات شرعاً جائز نہیں۔ تاہم اگر واقعی موجد مشینری کا مالک ہو اور وہ اس کی ذمہ داری قبول کر کے اس کا اجارہ کرے تو اس کی گنجائش ہے اور کرایہ مقرر کرتے ہوئے اس بات کو مد نظر رکھا جائے کہ مشینری کی قیمت بمعہ کچھ نفع کے وصول ہو جائے تو اس میں بھی کوئی شرعی قباحت نہیں، مگر معاہدے میں یہ شرط نہ لگائی جائے کہ مدت اجارہ ختم ہونے پر مشینری خود بخود مستاجر کی ملکیت ہو جائیگی۔ اس لئے کہ اس میں ”صفقۃ فی صفقۃ“ کی شکل بن جاتی ہے۔ البتہ بغیر سابقہ شرط کے مدت ختم ہونے کے بعد اس کی طرف ملکیت منتقل کرنے کی گنجائش ہے۔

مراہمہ منوجلہ: یہ بھی تمویل کا ایک شرعی طریقہ ہو سکتا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ جب کوئی شخص بنک سے قرضہ لینے کے لئے آئے تو بنک اس سے پوچھے کہ کس چیز کو حاصل کرنے کے لئے رقم درکار ہے؟ بنک اس کو رقم دینے کی بجائے وہ چیز خرید کر مرابحہ نفع پر ادھار بیچ دیتا ہے۔ نفع بطور مسادمہ کے کوئی بھی قیمت طے کر کے لیا جاسکتا تھا مگر نفع ایک شرح طے کر کے مرابحہ اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ نظام میں یکسانیت رہے اور تمام لوگوں سے نفع ایک شرح کے ساتھ وصول ہو۔ نفع کی جو بھی شرح طے کی جاتی ہے۔ اس کو مارک اپ کہتے ہیں۔

یہ بھی تمویل کا ایک جائز طریقہ ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کو ٹھیک ٹھیک ضروری شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے۔ اس لئے کہ ادھار کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کرنا بافتاق فقہاء جائز ہے۔ اسلامی بنکوں میں اس طریقے پر بڑی وسعت کے ساتھ عمل ہو رہا ہے۔ لیکن یہ انتہائی نازک طریقہ ہے اس میں ذرا سی بے احتیاطی اس کو سودی نظام سے ملا دیتی ہے۔ آج کل بنکوں میں مرابحہ کی حقیقت کو سمجھنے بغیر اور اس کی ضروری شرائط کی رعایت کئے بغیر اس پر عمل ہو رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لہذا صحیح شرعی طریقے سے مرابحہ کرتے ہوئے ان

خراہیوں سے بچنا ضروری ہے۔

سوال نمبر ۴۔ کیا حکومت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ یہ ضمانت دے کہ غیر سودی بینک کو اگر نقصان اٹھانا پڑے تو پھر بھی

عند الطلب کھاتے داروں کا پورا سرمایہ محفوظ رہے گا۔ خواہ حکومت کو اپنے پاس سے ادا کرنا پڑے؟

جواب۔ صورت مسئلہ میں حکومت کیلئے ایسا ضمانت لینا شرعاً جائز نہیں کہ اگر غیر سودی بینک کو نقصان اٹھانا پڑے تو

پھر بھی عند الطلب کھاتے داروں کا پورا سرمایہ محفوظ رہے گا کیونکہ اس طرح مضارب بت کرنا مضارب بت قاسدہ ہے بلکہ

رب المال کو اس کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ یہ ضمانت سودی معاملات کے زمرے میں شمار ہے۔

”الغرم بالغنم یعنی ان من ینال نفع شی یتحمل ضرره۔“ (شرح المجملہ فائدہ الا تاسی ج ۲۳۵)

”ومن شروط المضاربة ایضا کون نصیب المضارب من الربح حتی لو اشترط له من راس المال

او منه او من الربح فسدت“ (شرح المجملہ لستم باز ۷۴۷)

”اذا فقد شرط من هذه الشروط المذكورة الفاعل كما اذا لم تكن حصة العاقلین من الربح جزءاً

شائعاً بل جعل لاحد هما من الربح قدر معین ککذا غر شاً فسدت المضاربة“ (شرح المجملہ لستم باز ۷۴۸)

سود:

سوال نمبر ۱۔ سود ہمارے سارے نظام معیشت میں بہت دور تک سرایت کر گیا ہے جس کی وجہ سے اس کا فوراً مکمل

خاتمہ بہت دشوار ہے سود کے خاتمہ کی شرعی طور ممکن صورتیں کیا ہو سکتی ہیں؟

جواب۔ صدیوں کی بیماری کا علاج فوراً ممکن نہیں بلکہ تدریجاً ممکن ہو سکتا ہے۔ سود کے خاتمہ کی شرعی طور پر ممکن

صورتیں یہ چار ہو سکتی ہیں۔ شرکت، مضارب بت، اجارہ، مراہجہ موجدہ

شرکت و مضارب بت: سود کا صحیح اسلامی متبادل شرکت اور مضارب بت کا طریقہ ہے۔ جو سود سے بدرجہا اچھے نتائج کا

حامل ہے۔ یہ تمویل کا نہایت مثالی عادلانہ منصفانہ طریقہ ہے۔ جس کے تقسیم دولت پر بہت اچھے نتائج مرتب ہوتے

ہیں۔ اس سے بینکنگ کا یہ تصور بھی ختم ہو سکتا ہے کہ بینک کاروبار کے عمل سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہوئے صرف

سرمایہ فراہم کرنے کے لئے واسطہ بنتا ہے شرکت اور مضارب بت کا نظام جاری ہونے کی صورت میں بینک کا نام خواہ بینک

ہی رہے لیکن بینک کی یہ حیثیت ختم ہو جائے گی اب بینک کا باقاعدہ کاروبار میں عملاً دخل ہوگا۔

شرکت اور مضارب بت میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ شرکت میں شرکاء سرمائے میں بھی حصہ دار ہوتے ہیں اور

عمل میں بھی حصہ دار ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی عملاً کاروبار میں دخل نہ دے یہ الگ بات ہے اور مضارب بت میں رب المال کا

سرمایہ ہوتا ہے اور مضارب عمل کرتا ہے رب المال کی عمل میں شرکت نہیں ہوگی۔

اب یہاں شرکت اور مضارب سے کہ جس بنیادی اصول پر ان کے خاتمہ میں شرکت اور مضارب بت کا معاملہ

کرتے ہوئے ان کی رعایت ضروری ہوگی۔

(۱) سرمائے کے تناسب سے نفع مقرر کرنا شرعاً جائز نہیں نفع مقرر کرنے کا صحیح شرعی طریقہ یہ ہے کہ جو نفع حقیقت میں ہوگا اس کا فیصد حصہ مقرر کیا جائے۔

(۲) نفع کا جو تناسب بھی چاہیں باہمی رضامندی سے طے کر سکتے ہیں۔ مثلاً کسی کا سرمایہ چالیس فی صد ہو اور اس کے لئے ساٹھ فی صد نفع کی شرط لگائی جائے اور دوسرے کا سرمایہ ساٹھ فی صد ہو اور اس کے لئے چالیس فی صد نفع کی شرط لگائی جائے تو یہ جائز ہے۔ نفع کی تقسیم بقدر سرمایہ ضروری نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مختلف شرکاء کے لئے نفع کی مختلف شرحیں طے کی جاسکتی ہیں جس کو آج کل کی اصطلاح میں ”وزن“ (Weightage) دنیا کہتے ہیں مختلف شرکاء کو مختلف وزن دیا جاسکتا ہے۔ البتہ جس شریک نے کام نہ کرنے کی شرط لگائی ہو اس کا نفع اس کے سرمائے کے تناسب سے زائد نہیں ہو سکتا۔

(۳) نفع میں تو مختلف شرکاء کو مختلف وزن دیا جاسکتا ہے لیکن نقصان میں اس طرح کرنا جائز نہیں نقصان بہر حال سرمایہ کے بقدر ہوگا۔ جسکو فقہاء یوں تعبیر فرماتے ہیں۔

”الربح علی ما اصطلاحوا علیہ والو ضیعة بقدر راس المال“

اجارہ: یہ بھی تمویل کا ایک شرعی طریقہ ہے جس کو (Leasing) کہتے ہیں اور اس کی وضاحت سوال نمبر ۳ کے جواب میں ”اسلامی بینکاری“ کے موضوع کے تحت صفحہ نمبر ”۵“ پر ہو چکی ہے۔

مراجہ مؤجلہ: یہ بھی تمویل کا ایک جائز شرعی طریقہ ہے اور اس کی مکمل تفصیل بھی ”اسلامی بینکاری“ کے عنوان کے تحت سوال نمبر ۳ کے جواب میں گزر چکی ہے۔

بیع:

سوال نمبر ۱۔ معاملات بیع میں نقد اور ادھار علیحدہ علیحدہ قیمتیں رکھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ دلائل سے واضح فرمائیں۔
جواب۔ ادھار کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کرنا باتفاق فقہاء جائز ہے۔ مثلاً بینک نے جس ریٹ پر سامان خریدا ہے اس پر معین نفع کی زیادتی کیساتھ مشتری کو فروخت کرے گا اور ضمن ایک معین مدت کے بعد وصول کرے گا، تو شرعاً اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اکثر فقہاء کے نزدیک اس قسم کا عقد جائز ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وقد فسر بعض اهل العلم. قالو! بیعتین فی بیعة ان یقول! ابیعک هذا الثوب بنقد بعشرة، وبنسبة

بعشرین ولا یفارقہ احد البیعتین فاذا افارقه احد هما فلا باس اذا كانت العقدۃ علی احد منهما۔
بعض فقہاء ”بیعتین فی بیعة“ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مثلاً بائع یہ کہے کہ میں یہ کپڑا نقد دس درہم میں اور ادھار بیس درہم میں فروخت کرتا ہوں، لیکن پھر اس کے بعد بیع باتفاق کرتے ہوئے فریقین کے درمیان جدائی نہ ہوئی (تو

یہ صورت ناجائز ہے اور بیعتین فی بیعہ میں داخل ہے) البتہ اگر فریقین ایک بیع پر یعنی نقد یا ادھار پر اتفاق کرتے ہوئے جدا ہو گئے تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں (جامع ترمذی ج ۳ صفحہ ۵۳۳، باب ماجاء فی النسخ عن بیعتین فی بیعہ حدیث نمبر ۱۲۳۱) امام عبدالرزاق نے مصنف عبدالرازق میں امام زہری، طاؤس اور سعید بن المسیب سے نقل کیا ہے یہ حضرات فرماتے ہیں: ”لأبأس بان يقول: ابیعتک هذا الثوب بعشرة الى شهر، او بعشرين الى شهرين، فباعه على احد هما قبل ان يفارقه فلا بأس به و هكذا عن قتادة“ (مصنف عبدالرازق ج ۸ ص ۱۳۶)

”اس صورت میں کوئی حرج نہیں کہ بائع یہ کہے کہ میں یہ کپڑا ایک ماہ کے ادھار پر دس درہم میں اور دو ماہ کے ادھار پر بیس درہم میں فروخت کرتا ہوں اور پھر جدائی سے پہلے ایک صورت پر اتفاق کر کے کپڑا بیچ دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں امام قتادہ سے بھی یہی منقول ہے۔ امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: قال ابو حنیفۃ فی الرجل یکون له على الرجل مائة دينار الى اجل، فاذا حلت قال له الذی علیه الدین، یعنی سلعة یکون ثمنها مائة دينار نقداً، بمائة و خمسين الى اجل، ان هذا جائز، لا نها لم يشتر طاً شیئاً ولم يذكر امرأ یفسد به الشراء“ (کتاب الحجۃ علی اهل المدينة، ج ۲ ص ۶۹۴ باب ما يجوز فی الدین وما لا يجوز فیہ) ”امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص کے دوسرے کے ذمے سودینار تھے، جو معین تاریخ پر ادا کرنے تھے۔ جب وہ معین تاریخ آئی تو اس شخص نے جس پر دین تھا۔ یہ کہا کہ فلاں سامان جس کی قیمت نقد کے اعتبار سے سودینار ہے مجھے ادھار ایک سو پچاس دینار میں فروخت کر دو۔ یہ صورت جائز ہے۔ اس لئے کہ اس عقد کے اندر فریقین نے کوئی شرط نہیں لگائی اور نہ ہی فریقین نے کسی ایسی چیز کا ذکر کیا ہے۔ جو اس معاملے کو فاسد کر دے۔“

سوال نمبر ۲۔ اشاک ایچ بیج میں حصص کی فارورڈ ٹریڈنگ کیا شرعی طور پر جائز ہے یا ناجائز؟
جواب۔ غائب سودے (فارورڈ ٹریڈنگ) جن میں بیج کی اضافت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے وہ بھی شرعاً جائز نہیں۔ اس لئے کہ بیج کی وقت مستقبل کی طرف اضافت یا تعلیق باطلاق فقہاء ناجائز ہے البتہ مستقبل میں بیج کا وعدہ کیا جا سکتا ہے لیکن وقت آنے پر بیج باقاعدہ کرنی ہوگی۔

چونکہ غائب سودا بیع قبل القبض ہے اور بیج قبل القبض جائز نہیں ہے۔

بیج قبل القبض کی ممانعت کا مدار دو وجوہوں پر ہے۔

(۱) قبضے سے پہلے بیع مقدور تسلیم نہیں ہوتا، لہذا یہ بات یقینی نہیں ہے کہ وہ مشتری کو ضرور قبضہ کرادے گا یہ غرر ہے جس کی بناء پر بیج جائز نہیں۔

(۲) بیج قبل القبض کی ممانعت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قبضے سے پہلے بیع بائع کے ضمان میں نہیں آتا اور بیع مالہ

سوال نمبر ۳۔ مضاربہ میں پہلے سے طے شدہ منافع کی شرع حیثیت کیا ہے؟

جواب۔ مضاربہ میں پہلے سے طے شدہ (خاص مقدار میں) منافع شرعاً جائز نہیں۔ ایسی صورت میں مضاربہ تفسد ہے گی۔

قال العلامة ابو بکر الکا سانی: "و منها ان المشروط لكل واحد منهما من المضارب ورب المال من الربح جزاءً نصفاً او ثلثاً اوربعاً فان شرطاً عد دامقلاً بان شرطاً ان يكون لاحد هما مائة درهم من الربح او اقل او اكثر والباقي للآخر لا يجوز والمضاربة فاسدة (بلائع الفوائد ج ۶ ص ۸۵) نفع مقرر کرنے کا صحیح شرعی طریقہ یہ ہے کہ جو نفع حقیقت میں ہوگا اس کا کافی صد حصہ مقرر کیا جائے۔ (مزید تفصیل شرکت و مضاربہ کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں)

سوال نمبر ۴۔ بینکوں میں مروجہ مراہجہ کا طریق کار اسلامی اصولوں کے مطابق کہاں تک جائز ہے؟

جواب۔ بینکوں میں مروجہ مراہجہ کا طریق کار اگر مندرجہ ذیل خامیوں سے خالی ہو تو اسلامی اصولوں کے مطابق جواز کی گنجائش ہے۔

(۱) مراہجہ کی صحیح شکل تو یہ ہے کہ بینک کوئی چیز خرید کر نفع پر بیچ دے مگر پاکستانی بینکوں میں ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ جس چیز پر عقد مراہجہ کیا جا رہا ہے وہ چیز پہلے سے ہی اس شخص کے پاس موجود ہوتی تھی جو بینک سے قرض لینے کیلئے آیا ہے۔ بینک اس سے اس چیز کو نقد کم قیمت پر خرید کر پھر نفع پر اسی کو دوبارہ ادھار بیچ دیتا ہے اسکو بائی بیک (Buy Back) کہتے ہیں۔ اس طرح حقیقتاً مراہجہ کی بجائے نفع کو بائی بیک سے وابستہ کر دیا گیا۔ جو شرعی اعتبار سے بالکل ناجائز ہے کیونکہ ایک ہی شخص سے کم قیمت پر خرید کر فوراً ہی اسے زیادہ قیمت پر ادھار بیچ دینا درحقیقت سودی قرض ہی کی ایک شکل ہے۔ جبکہ پہلی خریداری میں ہی یہ شرط ہوتی ہے کہ اسے دوبارہ بیچ دیا جائیگا۔

(۲) بائی بیک کا حیلہ بھی حقیقت میں نہیں ہوتا عموماً محض فرضی کاروائی ہوتی ہے۔ ایسا سامان سرے سے موجود ہی نہیں ہوتا جس پر بائی بیک کیا جا رہا ہو۔ حتیٰ کہ اداروں کے ایسے اخراجات جن سے کوئی چیز خریدی نہیں جاتی مثلاً تنخواہیں، بلوں کی ادائیگی وغیرہ ان کے لئے بھی بینکوں سے مراہجہ قرض مل جاتا ہے۔

(۳) اگر بائی بیک نہ بھی ہو حقیقت میں مراہجہ ہی ہو تو بھی اس بات کا اہتمام نہیں کیا جاتا کہ جس سامان کو مراہجہ بیچا جا رہا ہے وہ پہلے بینک کے قبضے اور ضمان میں آئے حالانکہ مراہجہ کے درست ہونے کے لئے اس سامان کا پہلے بینک کے قبضے اور ضمان میں آنا ضروری ہے۔

(۴) بینک کے پاس جب کوئی شخص سرمایہ حاصل کرنے کے لئے آتا ہے تو بینک قمویل کی حد مقرر (تحدید السقف) کرتا ہے کہ اتنے سرمایہ ہی بینک کے لئے جائز ہے۔ اگر کوئی شخص اس حد سے زیادہ سرمایہ حاصل کرنے کے لئے آتا ہے تو بینک قمویل کی حد مقرر (تحدید السقف) کرتا ہے کہ اتنے سرمایہ ہی بینک کے لئے جائز ہے۔ اگر کوئی شخص اس حد سے زیادہ سرمایہ حاصل کرنے کے لئے آتا ہے تو بینک قمویل کی حد مقرر (تحدید السقف) کرتا ہے کہ اتنے سرمایہ ہی بینک کے لئے جائز ہے۔

ہیں۔ اس وقت بینک اس شخص کو سامان خریدنے کا وکیل بھی بنا دیتا ہے لیکن اس وقت کوئی بیع منعقد نہیں ہوتی بلکہ وہ شخص ایک باہمی معاہدہ ہوتا ہے کہ بینک حسب ضرورت ان شرائط پر اپنے گاہک کو اس کی ضرورت کی اشیاء خرید کر فراہم کرے گا۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ جب گاہک کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ بینک کو بتائے پھر بہتر طریقہ تو یہ ہوتا کہ بینک وہ چیز اپنے ذرائع سے خرید کر اپنے قبضے میں لاتا پھر گاہک کو مرابحہ فروخت کرتا، لیکن اگر بینک خود خریدنے کی بجائے اسی گاہک کو خریداری کا وکیل بنائے تو اس میں کم از کم یہ ضروری تھا کہ پہلے گاہک وہ چیز بینک کے وکیل کی حیثیت سے خرید کر بینک کو مطلع کرے پھر اس سے ایجاب و قبول کر کے اپنے لئے خریدے۔ یہاں گاہک کی دو حیثیتوں کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھنا ضروری تھا۔ پہلے اس کی حیثیت وکیل کی ہے اور جب تک وہ اس حیثیت میں ہے اس پر وکالت کے احکام جاری ہوں گے اور جب تک سامان پر اس کا قبضہ بینک کی وکیل کی حیثیت سے ہے اس وقت تک وہ سامان بینک کی ملکیت میں ہے اور اسی کی ضمانت میں ہے لہذا اگر اس دوران وہ سامان وکیل کی کسی تعدی کے بغیر ہلاک ہو جائے تو بینک کا نقصان ہونا چاہیے۔ پھر جب وہ بینک کو اطلاع دے کر اس سے وہ سامان اپنے لئے خریدے تو اس وقت سامان گاہک کی ملکیت اور ضمانت میں آجائے گا اور اگر اس کے بعد ہلاک ہو جائے تو گاہک کا نقصان ہوگا۔

گاہک کی ان دو حیثیتوں کا کلی طور پر ایک دوسرے سے ممتاز ہونا نہایت ضروری ہے۔ لیکن آج کل اکثر بینک اس بات کا لحاظ نہیں رکھتے بلکہ تحدید المسقف کے وقت یعنی Limit منظور کرتے ہوئے مرابحہ کے معاہدے پر جو دستخط ہوتے ہیں انہی کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد گاہک سامان خود خرید کر اسے اپنے استعمال میں لاتا رہتا ہے اور بینک سے خریداری کے لئے کوئی الگ ایجاب و قبول نہیں کیا جاتا جس کے نتیجے میں یہ شخص ایک مصنوعی کاروائی ہو جاتی ہے اور عملی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ بینک نے گاہک کو رقم دی اور ایک مدت کے بعد زیادہ رقم وصول کر لی۔ سامان کا بینک کے ضمان میں آنا پھر اس کی ملکیت کا گاہک کی طرف منتقل ہونا اور اسی مقصد کے لئے ایجاب و قبول وغیرہ کچھ نہیں ہوتا یہ طریقہ بالکل حرام اور ناجائز ہے۔

(۵) یہ غلطی بھی ہوتی ہے کہ تمویل کی حد مقرر کرنے (تحدید المسقف) کے معاہدے پر دستخط ہوتے ہی بینک اس شخص سے Bill of exchange (ہنڈی) یا پرامیٹری نوٹ پر دستخط کرا لیتا ہے۔ یہ اس لئے غلط ہے کہ ہنڈی پر دستخط تو اس وقت ہوتے ہیں جب کوئی شخص مدیون بن جاتا ہے اور یہ شخص ابھی بینک کا مدیون نہیں بنا، ابھی تو آئندہ مرابحہ مبادلہ کرنے پر آمادگی کا معاہدہ ہوا ہے۔ گاہک بینک کا مدیون اس وقت بنے گا جب وہ سامان بینک سے اپنے لئے خریدے گا، لہذا پرامیٹری نوٹ پر دستخط بھی اسی وقت ہونے چاہیے۔

(۶) سودی نظام میں قرضہ کی ادائیگی کا وقت آجائے اور مقروض ابھی قرض ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو یا ابھی ادا نہ کر چکا ہو تو اس قرضہ کی مدت بڑھادی جاتی ہے یا سود قرضے میں شامل ہو جاتا ہے اور اس پر مزید سود لگا

کر مزید مہلت دیدی جاتی ہے۔ اس کو رول اوور (Roll over) کرنا کہتے ہیں۔ مرابحہ میں یہی سلسلہ شروع کر دیا گیا مرابحہ کی ٹرن کی ادائیگی کا وقت آنے پر ادائیگی کی استطاعت نہ ہو تو یہاں بھی قرض کو رول اوور کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ تو ایک بیج تھی۔ اس میں سامان کی ایک قیمت طے تھی اس قیمت میں اب اضافہ یا کمی ممکن نہیں۔ نہ اس مرابحہ پر مزید مرابحہ کیا جاسکتا ہے۔ مرابحہ کی حقیقت اور شرائط کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے اس جیسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے معاملہ شرعی طور پر جائز نہیں رہتا۔ اسلئے مرابحہ پر عمل کرنے کیلئے اس کی شرائط کی رعایت بہت ضروری ہے۔

انشورنس:

سوال نمبر ۱۔ بیمہ کمپنی کے کاروبار کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر یہ کاروبار سودی ہے تو اس کے لئے متبادل شرعی طریقے کیا ہیں جن کے مطابق نقصانات کا ازالہ کیا جاسکے؟

جواب۔ بیمہ کمپنیوں کے کاروبار کی شرعی حیثیت: جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس بیمے میں قمار بھی ہے اور ربوا بھی۔ قمار اس لئے کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہے اور دوسری طرف سے ادائیگی مبہوم ہے۔ جو قسطیں ادا کی گئی ہیں وہ تمام رقم ڈوب بھی سکتی ہے اور اس سے زیادہ بھی مل سکتی ہے اسی کو قمار کہتے ہیں۔ اور ربوا اس طرح ہے کہ یہاں روپے کا روپے سے تبادلہ ہے اور اس میں تفاضل ہے کہ بیمہ دار کی طرف سے کم رقم دی جاتی ہے اور اسے زیادہ رقم ملتی ہے۔ البتہ بیمہ زندگی میں قمار نہیں کہ وہاں رقم یقیناً واپس مل جاتی ہے۔ مگر ربوا اور غرر ہے۔ ربوا تو ظاہر ہے۔ غرر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ارکان عقد (ضمن، مبیع یا اجل) میں سے کسی چیز کا مجہول ہونا یا کسی مجہول ادائیغہ معین واقعے پر موقوف ہونا۔ یہاں غرر اس طرح ہے کہ معلوم نہیں کہ کتنی رقم واپس ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جتنی رقم دی تھی وہی بمعہ سود کے واپس ملے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حادثے کی صورت میں زیادہ رقم مل جائے۔

بیمہ کا متبادل:

بیمہ کا متبادل ایک تو تعاونی بیمہ ہے جس میں شرکاء اپنی اپنی مرضی سے فنڈ میں رقم جمع کراتے ہیں اور سال کے دوران جن جن لوگوں کو کوئی نقصان پہنچا۔ اس فنڈ سے ان کی امداد کرتے ہیں۔ پھر سال کے ختم پر اگر رقم بچ گئی تو وہ شرکاء کو حصہ رسدی واپس کر دی جاتی ہے یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے فنڈ کے لئے چند۔ کے طور پر رکھ دی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ اب عالم اسلام کے کئی ملکوں میں ”شرکات التکافل“ کے نام سے کچھ کمپنیاں قائم ہوئی ہیں جنہیں تجارتی بیمے کے متبادل کے طور پر قائم کیا گیا ہے۔ ان کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ہر بیمہ دار کمپنی کا شیئر ہولڈر ہوتا ہے کمپنی اپنا سرمایہ نفع بخش کاموں میں لگا کر اس کا نفع اپنے شیئر ہولڈرز میں تقسیم بھی کرتی ہے اور کمپنی ہی کی ایک ریزرو فنڈ سے بیمہ داروں کے نقصانات کی تلافی بھی کرتی ہے۔ (تخصیص از ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ اور ”فقہی مقالات“)

زکوٰۃ:

سوال نمبر ۱۔ کیا زکوٰۃ کی رقوم کا استثمار شرعی طور پر جائز ہے یا نہیں؟ یعنی زکوٰۃ کی رقوم سے اس مقصد کی خاطر کارخانے اور فیکٹریاں وغیرہ قائم کرنا کہ ان سے حاصل ہونے والے منافع کو مستحقین زکوٰۃ میں تقسیم کیا جائے گا اور ان کارخانوں میں فقراء و مساکین اور دیگر مستحقین کو ملازمت دے کر انہیں روزگار فراہم کیا جائے گا، شرع نقطہ نظر سے جائز ہے یا نہیں؟

جواب۔ زکوٰۃ کی رقوم کے استثمار میں کئی قباحتیں ہیں۔

- (۱) اس صورت میں تملیک مسکین نہیں ہوتی ہے اور زکوٰۃ میں تملیک (بقضہ) مسکین شرط ہے۔
- (۲) کارخانوں میں ہر ملازم مستحق زکوٰۃ نہیں ہوتا ہے بلکہ اکثر ملازمین زکوٰۃ کے مسائل میں غنی کے حکم میں ہوتے ہیں۔ مسکین ملازم کا امتیاز مشکل ہو جائے گا۔
- (۳) زکوٰۃ کا نفع صرف ان لوگوں کو ملے گا جو ملازمت کے اہل ہو اور جو ملازمت کے اہل نہیں۔ جیسے ان پڑھ لوگ، بوڑھے، بیوائیں اور وہ یتیم اور نادار جس کا کوئی سفارش کرنے والا نہ ہو تو ان کو کچھ نفع نہیں ملے گا۔
- (۴) کارخانہ بننے کے کچھ عرصہ بعد بنانے والے کے درثناء اس کو میراث سمجھ کر پھر اپنی ملکیت میں داخل کریں گے حالانکہ زکوٰۃ کے اموال میں ارث جاری نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ تو مالک کی ملکیت سے نکل چکے ہیں۔
- (۵) یہ تو ضروری نہیں کہ کارخانہ خواہ مخواہ نفع کمائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ کارخانہ دیوالیہ ہو جائے تو مسکین سب کچھ سے محروم رہے گا۔

سوال نمبر ۲۔ اموال زکوٰۃ کے استثمار کے جائز یا ناجائز ہونے کے دلائل اور اسباب و وجوہ کتاب و سنت کی روشنی میں بیان فرمائیں؟ تملیک کی شرط کے شرعی دلائل کیا ہیں؟

جواب۔ زکوٰۃ کے استثمار میں جو قباحتیں ہیں وہ سوال نمبر ۱ کے جواب میں مذکور ہیں۔ البتہ تملیک کی شرط کے شرعی دلائل یہ ہیں۔

(۱) وَاُولَٰئِكَ الزَّكٰوٰةُ (الایہ)

(۲) اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ الْخ. (الایہ)

(۳) قَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِدْوَا زَكَاةَ اَمَوَالِكُمْ (الحديث)

(۴) وَقَالَ الشَّيْخُ ابْنُ الْهَمَامِ: وَلَا يَبْنِي بِهَا مَسْجِدٌ وَلَا يَكْفَنُ بِهَا مَيِّتٌ لِانْعِدَامِ التَّمْلِيكِ وَهُوَ الرِّكْنُ وَلَا يَقْضَىٰ بِهَا دَيْنٌ مَيِّتٌ لِانْ قَضَاءِ دَيْنِ الْغَيْرِ لَا يَقْضَىٰ التَّمْلِيكُ مِنْهُ لَا سِيَّمَا مِنَ الْمَيِّتِ وَلَا تُشْتَرَىٰ بِهَا رَقَبَةٌ تَعْنِي خِلَافَ الْمَالِكِ ذَهَبَ إِلَيْهِ تَابِلٌ قَوْلُهُ تَعَالَىٰ وَفِي الرِّقَابِ وَلَنَا

ان الا عتاق اسقاط الملک و لیس بتملیک۔ (بحوالہ فتح القدیر ج ۲ کتاب الزکوٰۃ)

سوال نمبر ۳۔ زکوٰۃ کے مال سے اگر رہائشی مکانات یا دوکانیں تعمیر کر کے فقراء و مساکین کو رہائش یا تجارت کیلئے دیدی جائیں اور انہیں مکانات اور دوکانوں وغیرہ کا مالک نہ بنایا جائے۔ تو کیا اس سے زکوٰۃ کی ادائیگی ہو جائیگی یا نہیں؟
جواب۔ مندرجہ بالا (سوال نمبر ۲ کے جواب میں) لائل سے واضح ہوا کہ زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے اور یہ مذکورہ فی السوال صورت میں تملیک نہیں ہے۔ لہذا زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

سوال نمبر ۴۔ فقراء و مساکین میں مال زکوٰۃ تقسیم کرنے کی بجائے اگر ان کے لئے زکوٰۃ کے مال سے مکانات یا دوکانیں تعمیر کر کے ان کی ملکیت میں دیدی جائیں تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ اس میں شرعاً اگر کوئی قباحت ہے تو اسے دلائل کے ساتھ واضح فرمائیں۔

جواب۔ اس صورت میں کئی خدشات ہیں۔

(۱) زندہ کے مشاہدہ میں کئی بار آیا ہے کہ جو شخص نقد کی بجائے مسکین کو زکوٰۃ میں سامان فراہم کرتا ہے تو مزکی اس زکوٰۃ میں بھی تجارت کرتا ہے۔ مثلاً سو روپیہ کی قیمت والا سامان ایک سو پچاس کے حساب سے مسکین کو دیا جاتا ہے تو مزکی نے مسکین سے سو روپیہ زکوٰۃ میں پچاس روپے کمائی کی یہ مسکین کو نقصان ہے تو یہاں ہو سکتا ہے کہ گھر پر خرچہ ایک لاکھ آیا ہو اور مسکین کو یہ گھر دو لاکھ میں حساب کیا جائے تو یہ مسکین کو نقصان ہے۔

(۲) اس صورت میں ایک مسکین کو نفع ملے گا اور دیگر مساکین محروم ہوں گے اس وجہ سے فقہاء کرام نے ایک مسکین کو مقدار نصاب زکوٰۃ دینے کو مکروہ کہا ہے کیونکہ اس سے اور مساکین محروم ہوتے ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ ایک لاکھ روپیہ جس سے گھر بنانا ہو ایک مسکین کو ملے اور اگر نقد رقم پانچ پانچ ہزار ایک ایک مسکین کو دیئے جائیں تو ایک نقد رقم سے کم از کم بیس مساکین کا گزارہ ہو جائیگا۔

(۳) بھر عام اغنیاء وہ مکان اور دوکان زکوٰۃ میں دیں گے جو ان کے لئے کارآمد نہ ہو۔ تو گویا صرف برائے نام (اخلاص سے خالی) زکوٰۃ ہوگی اور آخرت کے لحاظ سے اس قسم کی زکوٰۃ کارآمد نہیں ہے۔

سوال نمبر ۵۔ کیا موجودہ حالات کے تناظر میں اموال زکوٰۃ، مصارف زکوٰۃ، نصاب زکوٰۃ اور شرح زکوٰۃ میں کمی بیشی کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

جواب۔ اموال زکوٰۃ، مصارف زکوٰۃ، نصاب زکوٰۃ، شرح زکوٰۃ یہ سارے منصوص امور ہیں اجتہادی امور نہیں ہیں۔ یہ توفیقی امور ہیں مددک بالعقل نہیں ہیں لہذا اس میں کمی بیشی کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں یہ جائز بلکہ افضل ہے کہ ایک غنی شخص مقدار زکوٰۃ سے زیادہ مقدار مسکین کو دے دیں یہ زیادہ حصہ نقلی صدقہ میں شمار ہو کر مسکین کے ساتھ تعاون ہو گا۔